ڈاکٹر محمد فاروق خان
وائس چانسلر اسلامی یونیورسٹی، سوات

مالاکنڈ قبائلی علاقے اور نفاذ شریعت

ملاکنڈ ڈویژن، خصوصاً سوات میں نفاذ شریعت کے مسئلے

اصل نوعیت یہ ہے کہ عوام جلدی اور سستا انصاف چاہتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو پاکستانی قوانین پر کچھ بنیادی اعتراض ہے، بلکہ اُن کی اصل شکایت ہے کہ عدالتوں میں کیس سال ہا سال لٹکے رہتے ہیں اور متاثرہ فریق کو انصاف نہیں ملتا۔ نیز وکیلوں کی فیسیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ دراصل 1970ء سے پہلے ریاست سوات میں انصاف کا بہت اچھا نظام قائم تھا۔ ہر سول معاملے کا فیصلہ دو تین مہینوں کے اندر ہو جاتا تھا اور ہر فوجداری معاملے میں تین چار ہفتے کے اندر اندر مجرم کو سزا مل جاتی تھی۔ اس انصاف پر کسی کا کوئی خرچ نہیں آتا تھا۔ جب لوگ آج کے حالات کا موازنہ اُس وقت سے کرتے ہیں تو وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ آج کے حالات میں جلد اور سستا انصاف کیوں نہیں مل سکتا۔ میرے نزدیک اگر ایک اصلاح کی جائے تو لوگوں کی یہ شکایت ختم ہو سکتی ہے۔ ہر تحصیل سطح پر پچاس کے قریب دیانت دار اور منصف مزاج کی ایک فہرست بنائی جائے۔ ہر سول اور فوجداری مقدمہ ان افراد میں سے پانچ یا سات افراد کے جرگے کے سپرد کیا جائے۔ یہ پانچ یا سات افراد متاثرہ فریقوں کی رضامندی سے چُنے جائیں۔ اس جرگے پر یہ لازم ہو کہ وہ ایک خاص مدت کے اندر سول معاملے کا فیصلہ کرے اور فوجداری معاملے میں مجرم کا تعین کرے، جب کہ سزا کا تعین عدالت کرے۔ اگر یہ فیصلہ کسی فریق کو نامنظور ہو تو وہ سیشن کی عدالت میں اس پر اپیل کر سکتا ہے۔ اس کے بعد یہ کیس ہائی کورٹ تک بھی جا سکتا ہے جس کا فیصلہ آخری ہو۔ سپریم کورٹ کو صرف صوبوں اور مرکز کے درمیان تنازعات جیسے امور نمٹانے کے لیے مختص کیا جائے۔ میرے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ جتنے پُرانے کیس سال ہا سال سے عدالتوں میں لٹکے ہوئے ہیں ان کو بھی فیصلے کے لیے، جرگوں کے حوالے کیا جائے۔ درحقیقت سب ترقی یافتہ ممالک میں جیوری کے نام سے ایسے ہی جرگے کام کر رہے ہیں۔

سوات کی اسی بے چینی سے مختلف طبقات نے فائدہ اٹھایا اور ایسے مطالبات پیش کیے جن کا اصل معاملے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ بدقسمتی سے سابقہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے کسی شورش کی بروقت روک تھام نہیں کی، بلکہ ہر معاملے پر سے آنکھیں بند کیے رکھیں۔ حتیٰ کہ جب حالات قابو سے بالکل باہر ہونے لگے تب مداخلت کی۔ ظاہر ہے کہ اس کے نتیجے میں حالات بہت بگڑے۔ جب 2003ء میں مولانا فضل اللہ نے اپنی تحریک شروع کی تو اہلِ دانش فوراً اس تحریک کے اندر موجود خطرے کو سمجھ گئے اور اُنہوں نے تقاریر، مضامین، تبصروں اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعے اُس وقت کی مرکزی اور

صوبائی حکومت کو بار بار متنبہ کیا۔ مولانا فضل اللہ (جس نے صرف تین برس دینی تعلیم حاصل کی ہے اور اُس کے باقی ساتھیوں میں سے بھی کسی نے باقاعدہ دینی تعلیم حاصل نہیں کی) نے عورتوں کی تعلیم کی شدومد سے مخالفت کی، پولیو قطروں کو غیر اسلامی قرار دیا اور اپنے FM ریڈیو کے ذریعے اپنا پیغام پورے سوات تک پہنچایا۔ لیکن اس تحریک کو چار برس تک بھرپور ڈھیل دی گئی جس کا نتیجہ اب جان و مال کی ایک بڑی تباہی کی شکل میں سامنے موجود ہے۔

باقی قبائلی علاقوں میں اصل مسئلہ نفاذ شریعت کا نہیں بلکہ سیاسی ہے جس کا تعلق افغانستان کے سابقہ حالات، سابقہ فوجی حکومت کی بنائی ہوئی پالیسیوں اور بین الاقوامی حالات سے ہے۔ اس کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ جب روسی افواج نے افغانستان کو اپنے قبضے میں کر لیا تو اُس وقت کے پاکستانی صدر جنرل ضیاء الحق نے، بجائے اس کے کہ افغان تحریک مزاحمت کی ایک متحد جلاوطن حکومت بنتی، اُس حکومت کو امریکہ اور اقوام متحدہ تسلیم کرتی اور اُس جلاوطن حکومت کے تحت جنگ آزادی لڑی جاتی، یہ حکمت عملی اختیار کر لی کہ افغان تحریک مزاحمت کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ہر تنظیم کو اسلحہ اور ڈالر دیے گئے۔ ان تنظیموں کو پاکستان کے قبائلی علاقوں میں اپنے ٹریننگ کیمپ بنانے اور رہنے بسنے کی اجازت دی گئی۔ اس کی وجہ سے آہستہ آہستہ قبائلی علاقوں کا پورا سوشل آرڈر تبدیل ہو کر رہ گیا۔ افغان مجاہدین و مہاجرین نے ہر گاؤں میں نئے مدرسے اور مساجد تعمیر کر لیے۔ جلد ہی سارے قبائلی علاقے میں ہر مسجد میں افغانی امام اور خطیب بن گیا۔ اس طرح قبائلی سرداروں اور ملکوں کا پُرانا نظام ٹوٹ پھوٹ کر شکار ہو گیا۔ جب افغانستان کے پشتون علاقوں پر طالبان کا قبضہ ہو گیا تو ان تمام علاقوں کے افغان بھی طالبان کے زیرِ اثر اُن کے ساتھی بن گئے کیونکہ اکثر قبائلی علاقوں کا کلچر اور رہن سہن افغانوں کی طرح ہے۔ جب نائن الیون کے بعد افغانستان پر امریکہ نے قبضہ جما لیا تو طالبان کو اپنے گوریلا جنگ جاری رکھنے میں بہت مشکل پیش آئی۔ چنانچہ طالبان نے پاکستان کے قبائلی علاقوں کو اپنا باقاعدہ بیس کیمپ بنا دیا۔ اُس وقت کی حکومت بین الاقوامی طور پر امریکہ کا ساتھ دیتی رہی اور اندرونی طور پر اُس نے اِس بیس کیمپ سے اغماض برتا۔ ظاہر ہے کہ یہ تضاد زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ جب لال مسجد کا سانحہ پیش آیا اور اس کے ساتھ ساتھ تحریک طالبان پاکستان نے اس بیس کیمپ کو اپنی ایک ریاست کی شکل دینی شروع کی تو تصادم ناگزیر ہو گیا۔ تحریک طالبان اس پورے علاقے کو اپنا مقبوضہ علاقہ تصور کرتی ہے۔ وہ اس بات پر مصر ہے کہ یہاں اُس کا فہم اسلام بزور نافذ ہو گا۔ اس تحریک کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ کسی سرحدی حد بندی پر یقین نہیں رکھتی اور اس کے اعلان کے مطابق اس کی اصل وفاداری امیر المومنین ملا عمر کے ساتھ ہے۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان کا معاملہ، کرم ایجنسی میں سُنی شیعہ آویزش، خیبر ایجنسی میں مختلف گروہوں کی آپس میں لڑائیاں، باجوڑ اور مہمند ایجنسی کی صورت حال دراصل اسی طریقِ عمل کے مختلف پیرایہ اظہار ہیں۔ یہاں دینی اعتبار سے دو اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا یہ جائز ہے کہ ایک مسلح گروہ پاکستان کے کسی حصے پر قبضہ کر کے اپنا فہم اسلام بزور لوگوں پر نافذ کرے اور دوسرا یہ کہ کیا اسلامی تعلیمات کے مطابق بین الاقوامی سرحدات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ان دونوں معاملات کے ضمن میں راقم الحروف کا جواب ''نہیں'' میں ہے۔ دینی اعتبار سے یہ لازم ہے کہ لوگوں کے آزادانہ مشورے سے اُن کا نظام چلایا جائے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنا نقطہ نظر دوسروں پر مسلط کرے۔ دوسرے سوال کے ضمن میں گزارش ہے کہ سورہ انفال کی آخری چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ

ریاست کی حدود کی ایک بڑی اہمیت ہے۔ نیز اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح کسی شخص کی جائیداد اور زمین میں کوئی دوسرا شخص بغیر اُس کی اجازت کے داخل نہیں ہو سکتا، یہی حال ایک ملک کی سرحدات کا ہے۔ پاکستان سولہ کروڑ عوام کی ملکیت ہے۔ اس کے بین الاقوامی حدود کو مملکت کے عوام نے اپنے آئین کے ذریعے مقرر کیا ہے۔ یہ آئین ایک مقدس معاہدہ ہے جس کی پیروی سب پر لازم ہے۔ چنانچہ بین الاقوامی سرحد کی خلاف ورزی کے لیے دین سے کوئی جواز تلاش نہیں کیا جا سکتا۔